مولانا محمد حنیف ندوی

اسلام کا تصورِ ثقافت

اسلام نے فرد کی ذہنی الجھنوں کو کس حد تک حل کیا ہے، اسے کن اقدار سے مالا مال کیا ہے؟ اور تکمیل و ارتقا کی کن منزلوں کی طرف اس کی رہنمائی کی ہے۔ اس بحث سے ہم فارغ ہو چکے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے معاشرہ کی تہذیبی و ثقافتی مشکلات کیا ہیں۔ قرآن اجتماعی زندگی کا کیا نقشہ تجویز کرتا ہے اور کس طرح ان شکوک و شبہات کا تسلی بخش جواب مہیا کرتا ہے جو ہماری اجتماعی زندگی کے بارہ میں ابھرتے ہیں۔ یہ بحث مندرجہ ذیل تین ابواب پر مشتمل ہوگی :

۱۔ اسلام کا تصورِ ثقافت۔

۲۔ اسلام اور اس کی سیاسی قدریں۔

۳۔ اقتصادیات میں اسلام کا موقف۔

ثقافت کسے کہتے ہیں؟ کن عوامل سے اس کا تار و پود تیار ہوتا ہے۔ اس کی غرض و غایت کیا ہے۔ اس کی اپنی چال کا نہج کیا ہے اور یہ کن اصولوں کو اپناتی ہے اور کن عناصر کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتی ہے۔

ان سوالات کے جوابات اگرچہ خالص علمی نوعیت کے حامل ہیں تاہم ان سے نمٹے بغیر بحث کو آگے بڑھانا مشکل ہوگا۔ مشکل بھی ہوگا اور غیر مفید بھی۔

ثقافت دراصل انگریزی لفظ کلچر (CULTURE) کا ترجمہ ہے۔ زندگی کے اسلوب و انداز کے معنوں میں سب سے پہلے اس لفظ کو بیکن نے استعمال کیا۔ اور پھر ادبی دنیا میں چل نکلا۔

اس کی صحیح صحیح منطقی تعریف اتنی ہی محال ہے جتنی خود زندگی کے دائرہ اطلاق کی جس طرح زندگی کے فہم و ادراک کے متعدد پیمانے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اسلوب زندگی کو سمجھنے کے لیے

بھی کوئی ایک ہی پیمانہ یا لگی بندھی تعریف نہیں ہو سکتی۔ مختلف لوگوں نے اس کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔ جمالیات کے پرستاروں نے تصویر، مجسمہ سازی اور نغمہ و لے میں اس کی جھلک دیکھی ہے۔ اخلاقیات کے شیدائیوں نے اُسے خیر، خوبی اور کمال میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اجتماعیات پر نظر رکھنے والوں نے اسے انسان کی ان کوششوں میں ڈھونڈھنے کی جدوجہد کی ہے جن سے زندگی کے اشکالات تضاد کی گرفت سے نکلتے اور آزاد ہوتے ہیں پھر ایک اور تقسیم بھی ہے کچھ لوگوں نے ثقافت سے مادّی ترقیات ہی مراد لی ہیں ——— اور کچھ وہ ہیں۔ دین جن کے نزدیک اس کا اہم اور ناگزیر جز ہے۔ غرض یہ ہے کہ زندگی کا بت طناز چونکہ ہزار شیوہ ہے اس لیے اس کی توجیہات بھی گوناگوں ہیں۔ اس سلسلہ میں اہم علمی کوشش یہ ہے جس کو A.L. KROEBE اور اس کے ایک فاضل دوست نے انجام دیا۔ ان دونوں نے ثقافت کی سینکڑوں تعریفات کو جانچا پرکھا۔ ان پر تنقید و تفحص کا حق ادا کیا اور آخر کار جس پر اُن کا اتفاق ہوا وہ یہ ہے۔

"ثقافت دراصل کچھ نمونوں اور معیاروں سے تعبیر ہے۔ یہ معیار چاہے ظاہر اور نمایاں ہوں۔ چاہے زندگی کے دبیز پردوں میں نہاں ہوں۔ نیز ثقافت کا اطلاق سلوک و معاملہ کی اس نوعیت پر ہوتا ہے جس کو بر بنائے شعور و آگہی اختیار کیا گیا ہو اور ایک گروہ نے دوسرے گروہ تک اس کو پہنچایا ہو۔ معاملہ و سلوک کی یہ نوعیتیں درحقیقت رموز ( ) ہیں۔ جو یہ بتاتے ہیں کہ کسی گروہ نے کیا ترقی کی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ثقافت کے معنی ایسی روایت کے ہیں جو سابقہ و حال کے تجربات پر مبنی ہوتی ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مستقبل کی تعمیر میں یہ طریق زندگی کس حد تک کام آسکتا ہے۔

ٹھیٹھ منطقی اصطلاح میں اسے تعریف کہنا مشکل ہے لیکن اگر خود تعریف کی تعریف یہ ہے کہ جس سے کسی حقیقت پر روشنی پڑتی ہو تو ان معنوں میں یہ بلاشبہ تعریف ہے۔ اس میں ثقافت کے جن ضروری اجزا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) ثقافت کا حقیقی تعلق معیار سے ہے۔

(۲) اس میں شعور و ادراک بھی ایک اہم عامل ہے۔

(۳) یہ بھی ضروری ہے کہ یہ معیار کسی نوع یا معاشرہ کی عملی زندگی میں جاری و ساری ہو۔

(۴) اس طرز زندگی کو اس نہج کا ہونا چاہیے کہ اس پر صحت مند مستقبل کی تعمیر ہو سکے۔

۱۹۵۰ء تک امریکہ کے ماہر اجتماعیات قریب قریب اس تعریف پر متفق رہے۔ برطانوی مدرسہ فکر نے ثقافت کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے۔

"ثقافت ایسی شعوری وحدت کو کہتے ہیں جو موجود، کارفرما اور کسی معاشرہ کی ضروریات کی متکفل ہو۔ اور نظم و قاعدہ میں منسلک ہو۔" یہ یاد رہے کہ برطانوی مدرسہ فکر میں شعوری عمل کو نسبتاً زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہی نہیں بعض حضرات تو ثقافت کی تعریف میں جمالیات (Aesthetics) کو بھی ایک اہم عنصر گردانتے ہیں۔ چنانچہ آرنلڈ کا کہنا ہے۔ ثقافت کا تعلق علم و ادراک کی اس جامع کیفیت سے ہے جو ان تمام خوبیوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہو۔ جن سے اب تک انسان آشنا ہو چکا ہے۔ ان کے نزدیک ثقافت کے معنی کمال (Perfection) کو جاننے اور معاشرہ میں رائج کرنے کے ہیں۔

سر ولیم گل برٹ کے نقطۂ نگاہ سے ثقافت کا تعلق کسی قوم یا معاشرہ سے زیادہ باکمال افراد سے ہے۔ اُن کا قول ہے۔

"اگر تم لطیف اور بلند تر ذوق کی جھلک دیکھنا چاہتے ہو تو ان نادر الوجود لوگوں کی تلاش کرو جو صحیح معنوں میں تہذیب و ثقافت کے حامل ہیں۔

تعریف میں یہ تنوع جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، کچھ تو خود زندگی کے تنوع کی وجہ سے ہے اور کچھ اس لیے کہ اس کے مشمولات یا دائرہ اطلاق میں تنوع پایا جاتا ہے۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے اجتماعی سلوک و عمل ہی پر توجہ مرکوز رکھی۔ کچھ لوگ اس سے آگے بڑھے اور انکی نظر ان پیمانوں اور معیاروں تک پہنچی جن کی وجہ سے کسی گروہ یا معاشرہ میں سلوک و عمل پیدا ہوتا ہے۔ پھر ایک گروہ نے اس میں یوں تطبیق دینے کی کوشش کی۔ کہ ثقافت سلوک و عمل اور معیار و پیمانہ دونوں کا نام ہے۔ ایک کا نہیں۔ ایک اور قلیل جماعت نے اس کے معنوں میں وسعت پیدا کی اور اس کو چنگ و رباب، نغمہ و لے اور تصویر و مجسمہ تک پھیلا دیا۔

بہرحال اپنی اپنی نظر اور اپنا انتخاب ہے۔ ہمیں تو یہ تعریف زیادہ پسند ہے کہ ثقافت میں فکر و عمل کی وہ تمام کوششیں داخل ہیں جو کسی نہ کسی تضاد کو رفع کرتی ہیں۔ چاہے یہ تضاد جسم و روح میں ہو۔ چاہے انسان اور اس کے عالم خارجی میں پایا جائے اور چاہے اس کا تعلق ان الجھنوں سے ہو جو انسان اور انسان کے مابین رونما ہیں۔ یعنی اگر کوئی تہذیب انسانی مشکلات کا کوئی مداوا تجویز نہیں کرتی تو وہ سرے سے تہذیب ہی نہیں۔

ہم ثقافت میں فکر و عمل کی تمام کوششوں کو اس بنا پر داخل سمجھتے ہیں کہ ہمارے نزدیک تہذیب و ثقافت کا تانا بانا ان دونوں سے مل کر تیار ہوتا ہے۔ نہ تنہا فکر و تصور کی استواریاں اس لائق ہیں کہ کسی ثقافت کی تخلیق و آفرینش میں حصہ لے سکیں اور نہ عمل، روایات اور واقعات و حالات کی تاریخی ترتیب اس قابل ہے کہ نئی تہذیب و ثقافت کی داغ بیل ڈال سکے۔ اس مسئلہ میں اختلاف رائے قدیم سے چلا آ رہا ہے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تہذیب و تمدن کی گہما گہمی عقل و خرد کی اعجوبہ طرازیوں کی رہین منت ہے اور یہ دبستان صرف اس وقت تک سرسبز و شاداب رہتا ہے جب کچھ غیر معمولی ذہن اور نابغہ روزگار شخصیتیں اس کی آبیاری میں مشغول رہیں۔ دوسرا گروہ افراد سے زیادہ تاریخ ساز قوتوں پر بھروسا رکھتا ہے ان کی یہ رائے ہے کہ خود فکر و تصور کا سوتا مادی حالات و ظروف کی اثر اندازیوں سے تیار ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک تہذیب و ثقافت کے حسین نقوش صفحہ وجود پر ابھارنے والی چیز ذہن نہیں۔ فکر و تصور کی بلند پروازیاں نہیں۔ افراد اور ان کا کردار و عمل نہیں۔ یا یوں کہیے کہ انسانی عظمت نہیں بلکہ وہ مادی عوامل ہیں، وہ حالات و شرائط ہیں اور تاریخ کے وہ پُرزور تقاضے ہیں جن سے فکر و تدبر کے حدود متعین ہوتے ہیں۔

ہم اس بحث میں پڑے بغیر کہ فکر و روح کی کیا حقیقت ہے؟ اور فکر پہلے ہے یا مادی حالات۔ یہ کہیں گے۔ دونوں میں دراصل کوئی تناقض نہیں۔ جو لوگ فکر و ذہن کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہیں وہ کبھی یہ نہیں کہتے کہ فکر و ذہن کی تحرک تازیوں کے لیے مادی حالات و تغیرات کسی دائرہ کو متعین نہیں کرتے۔ اسی طرح جو حضرات تاریخ ساز قوتوں کو اہمیت دیتے ہیں وہ قطعی تاریخی جبر کے قائل نہیں ہو سکتے اور نہ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ تہذیب و ثقافت کی تخلیق و پرورش میں انسانی فکر و کاوش کا اہم حصہ ہے اس لیے کہ تاریخ کا تعلق بہرحال ان واقعات و حادثات سے نہیں ہے جس سے پہاڑ پتھر یا درخت دوچار ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ ان واقعات و حالات کا آئینہ ہے جس کو انسان اور ذی عقل انسان نے پیدا کیا اور ترتیب دیا ہے۔

ہمارے نزدیک اس نزاع میں قولِ فیصل یہ ہے کہ اگر فکر و تصور یا کوئی نظریہ حیات ٹھیک اس راہ پر گامزن ہے جو تاریخ کے مطابق ہے اور حالات و ظروف کے اندرونی تقاضوں سے ہم آہنگ ہے تو صحیح ہے اور اس کا کردار تخلیقی اور تقدم پسندانہ ہے۔ ورنہ یہ خدشہ ہے کہ ثقافت کا قافلہ پچھڑ جائے اور تکمیل و ارتقا کی منزلوں کو پا ہی نہ سکے۔ وجہ ظاہر ہے چونکہ ان تاریخ ساز عوامل کو انسان کی عظمت

فکر نے جنم دیا ہے اس لیے ضروری ہے کہ خود ذہن اور فکر و تعقل کے تقاضے ان کا احترام کریں۔ یہ تاریخ کی جبریت یا مادی حالات و شرائط کی مطلق العنانی نہیں۔ انسانی کی تخلیقی قوتوں کا ثمرہ اور صدیوں کی شعوری جدوجہد کا منطقی نتیجہ ہے۔ جس کو ہم تاریخ کے روپ میں دیکھتے ہیں اور تاریخی تقاضوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس مسئلہ میں گھپلا یہ ہے کہ جب ہم تاریخ ساز قوتوں کا نام لیتے ہیں یا تاریخی تقاضوں کا ذکر کرتے ہیں تو پہلے سے خواہ مخواہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ تاریخ یا تاریخ کے یہ تقاضے، انسانی فکر و کاوش کے صدیوں کے تجربہ سے الگ کوئی مستقل بالذات جابر و قاہر قوت ہیں جن کے مقابلہ میں انسان بالکل بے بس اور مجبور ہے حالانکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ خود انسان نے علم و آگہی میں جس حد تک ترقی کی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کو جس قدر رواج دیا ہے اور اس کے نتیجے میں جو نئے مسائل نئے سوالات اور نئی قدریں ابھری ہیں ان کی حیثیت ایک چیلنج کی ہے جس کو سمجھے اور جس سے نمٹے بغیر انسانی تہذیب و تمدن کو آگے نہیں بڑھایا جاسکتا یہاں سوال انسانی مجبوری کا نہیں، تگ و تاز اور سعی و کوشش کے دائروں کے تعین کا ہے۔

تاریخی تقاضے انسانی فکر کی تازہ کاریوں کو روکتے کب ہیں؟ یہ تو اس کے برعکس اس کی راہیں ہموار کرتے ہیں، اس کی منزل مقرر کرتے ہیں اور اس کے اندر اجتہاد و اختراع، ان مخفی اور تخلیقی قوتوں کو ابھار دینے کا باعث ہوتے ہیں جن سے مسائل کے حل و کشود میں مدد مل سکتی ہے۔

ہم اس بات کے قائل نہیں کہ تاریخی تقاضوں کی روشنی میں پہلے پیداوار کے ذرائع اور کو انقلاب لے ہیں اور پھر سائنس اور ٹیکنالوجی نے ترقی کی ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں، پہلے سائنس نے ترقی کی ہے انسانی علم و دانش نے معجزات دکھلائے ہیں اور اس کے بعد پیداواری قوتوں میں تجدید ہوئی ہے۔ اسی طرح ہمارا یہ عقیدہ نہیں کہ سقراط، افلاطون، ارسطو، ، کوپرینک اور بیکن کو تاریخی تقاضوں نے جنم دیا ہے۔ اس کے برعکس ہم اس حقیقت کے قائل ہیں کہ یہ فکر و دانش کے ان پیکروں کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے ایسی تاریخ کی تخلیق کی ہے جس نے آئندہ چل کر تہذیب انسانی کو چار چاند لگائے ہیں ہاں یہ صحیح بات ہے۔ اس تاریخ نے جس کے اوراق پریشان کی انسان کے دست ہنر شناس نے شیرازہ بندی کی ہے ترقی کے کچھ آئندہ حدود ضرور متعین کیے ہیں اور آگے کی سمتیں کچھ ضرور بتائی ہیں۔ لہذا فکر انسانی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ ایسی زقند لگا کر اپنے سفر کو انہی نقاط سے شروع کرے کہ جن نقاط سے یہ عرصہ ہوا آگے نکل آیا ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ اپنے دور کے ان مسائل اور تقاضوں سے روگردانی اختیار کرسکے۔

اس مختصر وضاحت کے بعد اس سوال کا جواب نسبتاً آسان ہو جاتا ہے کہ ثقافت کا تار پود کن عوامل سے تیار ہوتا ہے ہم کہہ چکے ہیں کہ ثقافت نظریہ و عمل سے ترتیب پذیر ہے اب یہ جاننے کی چیز ہے کہ نظریہ کے دو پہلو ہیں۔ مادی اور اخلاقی و روحانی۔ جہاں تک اس کے مادی پہلو کے ارتقا کا تعلق ہے ہم کہہ چکے ہیں کہ اس کا تمام تر سہرا انسان اور اس کی شعوری کوششوں کے سر ہے انسان نے اس کو ترقی دی ہے۔ انسان نے اسے بنایا اور سنوارا ہے لیکن کیا نظریہ کا اطلاق صرف انسان کی مادی ترقیات ہی سے متعلق ہے یا اس کا دائرہ اس سے کہیں وسیع تر ہے اور اس میں وہ جملہ اخلاقی و روحانی اقدار شامل ہیں، جن سے کوئی ثقافت زندہ رہتی پنپتی اور آگے بڑھتی ہے اور جن سے مختلف قوموں کے حدود امتیاز نکھرتے ہیں اور ان کے مخصوص طرز عمل کی وضاحت ہوتی ہے۔ ہماری رائے میں اس سلسلہ میں ادیان و مذاہب کے کردار کو نظر انداز کر دینا تاریخ کے ساتھ سراسر زیادتی اور ظلم روا رکھنے کے مترادف ہوگا۔ انسانی نظریات اور ذہنی نظریات میں ایک فرق ہے انسانی نظریہ کی غلطیاں اور خامیاں عمل سے واضح ہوتی ہیں اور طویل تجربے سے قوموں کو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کہاں کہاں خلل ہے یا نظریے کی کن خامیوں کی وجہ سے ان کی تہذیب و ثقافت میں تضادات ابھرے ہیں۔ اس لیے کہ انسانی علم بہرحال ناقص ہے اس کی صلاحیتیں حد درجہ محدود اور سمٹی ہوئی ہیں لہذا مستقبل کی آغوش میں جو تبدیلیاں رونما ہونے والی ہیں، اس کا پہلے سے علم کسی بھی شخص کو نہیں ہو سکتا۔

اس کے برعکس زندگی کے بارہ میں دین کا نظریہ اس اسلوب حیات سے تعبیر ہے جس کو اس ذات گرامی نے متعین کیا ہے جس نے خود زندگی کو زندگی بخشی ہے جس نے ذرہ کو خلیہ اور خلیہ کو گوشت پوست کے روپ میں ڈھالا ہے، جس کا علم کامل ہے اور اس درجہ وسیع اور محیط ہے کہ ماضی و مستقبل کے تمام احوال و کیفیات میں سے کوئی چیز بھی اس سے اوجھل نہیں۔

دینی نظریہ حیات کن معنوں میں تہذیب و ثقافت کا ناگزیر جز ہے۔ اس پر دو پہلوؤں سے گفتگو ہو سکتی ہے ایک ماضی کے نقطہ نظر سے اور ایک اس نقطہ نظر سے کہ انسان نے اس کو چھوڑ کر اور اس کے روحانی و اخلاقی ورثہ سے محرومی اختیار کر کے تباہی و بربادی کی کن کن نوعیتوں کو انگیز کیا ہے۔ ظاہر ہے، یہ پہلو اتنا نمایاں اور مسلمہ ہے کہ اس پر بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ مغرب میں اب متعدد اہل فکر نے اپنی زندگی کا مشن یہ بنا لیا ہے کہ تہذیب جدید نے جس بے راہ روی کو ابھار دیا

ہے اس کے خلاف تحریری دو عملی سطح پر جنگ کی طرح ڈالیں اور ایسے اداروں کی تشکیل کریں جو قلب و روح کو ان محرومیوں سے انسانی معاشرہ کو باز رکھنے کی کوشش کریں جن کی وجہ سے انسان محض جنسی حیوان ہو کر رہ گیا ہے۔ جہاں تک ماضی کا تعلق ہے ہم یہ اہلِ دانش سے پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہ انبیا علیہم السلام ہی کا ایک گروہ ہے جس نے انسان کو علم و ادراک کی پہلی روشنی عطا کی، جس نے اس کی تربیت کی ذمہ داریاں سنبھالیں، اور ہر ہر دَور میں گمراہی اور ضلالت سے بچانے کی سر توڑ کوشش کی جس نے اس میں عظمتِ انسانی کے مٹے ہوئے نقوش کو اُجاگر کیا جس نے اسے حسن عقیدہ اور حسن عمل کی راہیں سجھائیں۔ جس نے محبت و اُلفت کا اول اول درس دیا۔ جس نے دلوں میں توحید کی قندیلیں فروزاں کیں، اور اظہارِ حق و بے باکی کے جذبوں کی پرورش کی، جس نے عدل و انصاف کا بول بالا کیا۔ جس نے دنیا میں رہنے کے گُر بتائے۔ عمل و سیرت کے گوشوں کو زینت بخشی۔ اور مجموعی حیثیت سے فرد و معاشرہ کی توجہ کو نفس کی ادنیٰ خواہشات سے ہٹا کر اللہ کی طرف موڑ دیا۔ اور آج اس مادیت کے دَور میں بھی، اگر خوب کو سراہا جاتا ہے، خیر کی تعریف کی جاتی ہے اور قلب و ضمیر کی گہرائیوں میں نیکی اور خیر سگالی کی تڑپ پائی جاتی ہے اور لوگ مادی ترقی کے پہلو بہ پہلو اخلاقی اقدار کی اشاعت و فروغ کے حامی ہیں تو یہ ان پاکباز اور مقدس ہستیوں کا صدقہ ہے جنھوں نے اپنی پوری زندگی میں سچ پہ آنچ نہ آنے دی اور ظلم و تعدی کی آندھیوں میں بھی حق و صداقت کے چراغوں کو روشن رکھا۔

انبیا کے اس دین کو ترک کر کے اس دَور کے انسان نے کیا کھویا، اور کیا پایا۔ یہ داستان بہت دلچسپ ہے۔ دین نے انسان کے اندر چھپے ہوئے اس بلند تر انسان کو اُبھارنے اور اُجاگر کرنے کی کوشش کی تھی، جو تہذیب و ثقافت کے بارہ میں روحانی اقدار کا خیال رکھتا ہو، جو صرف گوشت پوست کی پرورش و اہتمام ہی کا حامی نہیں بلکہ روح کی توانائی اور باطن کی تابندگی کا بھی اتنا ہی خواہاں ہے۔ دین نے انسان میں اس احساس کو بیدار کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی کہ یہ صرف "حیوان نہیں" ہے اور ارسطو کی اصطلاح میں حیوان عاقل بھی نہیں۔ بلکہ اس میں ایک لطیف، مقدس اور نورانی عنصر ایسا بھی شامل ہے جس کی وجہ سے یہ "احسن تقویم" کے لقب سے سرفراز ہوا جس کی وجہ سے اس کا رابطہ، اللہ تعالیٰ سے استوار ہوتا ہے، اور اس کو عبدیت کا وہ مقام عطا ہوتا ہے کہ

جہاں معبودِ حقیقی کی توجہات خاص اس کو گھیر لیتی ہیں۔ لیکن بُرا ہو مادیت کا اس نے اس کو "حیوانیت" کی انہی پستیوں میں لا پھینکا ہے جہاں سے اس نے اپنے روحانی سفر کا آغاز کیا تھا۔

موجودہ غیر دینی تہذیب کی سب سے بڑی اور اصولی غلطی اور محرومی ہی تو ہے کہ انسان نے بقائمی ہوش و حواس اس بات کو مان لیا ہے کہ وہ حیوان اور صرف حیوان ہے۔

اس مرحلہ پہ ہم ڈارون کے نظریۂ ارتقا سے دو وجہ سے تعرض نہیں کرتے۔ ایک تو یہ کہ ہمارے ہاں کے مفکرین یعنی ابن خلدون، ابن مسکویہ اور رومی نے بھی تجربہ اور سائنس کے بل پر نہ سہی، ادراک و بصیرت کی سطح پر اس حقیقت کو بہرحال پا لیا تھا کہ زندگی ایک طویل سفر کے بعد انسان تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود یہ لوگ بھی انسانیت کی طرف سے مایوس نہیں ہوتے اور کبھی بھی انسان میں جو روحانی و اخلاقی مضمرات ارتقا پائے جاتے ہیں ان سے منکر نہیں ہو پاتے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ نظریۂ ارتقا کے یہ معنی ہی کب ہیں کہ چونکہ اس ارتقا کی ایک منزل حیوانیت تھی لہٰذا یہ اب بھی صرف حیوان ہی ہے۔ اور اس میں حیوانیت کے ساتھ ساتھ فہم و ادراک کے نئے نئے پہلوؤں نے ترقی نہیں کی۔

سائنس کی زبان میں ہم پوچھ سکتے ہیں کیا یہ ارتقا نوعی قسم کا نہیں اور اگر نوعی قسم کا ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ حیوانیت اس کے سفر میں ایک منزل تھی، اس میں مخصوص حالات و ظروف میں رہنے سے اس حقیقت کا بھی اضافہ ہوا ہے جس کو قرآن حکیم نے جنین کے کوائف بیان کرتے ہوئے "خلقاً آخر" لفظ سے تعبیر کیا۔

اس آیت میں قرآن حکیم یہ کہنا چاہتا ہے کہ انسان میں قطرۂ آب سے لے کر علقہ اور مضغہ تک جو تبدیلیاں ہوتی ہیں ان سب کا تعلق تو بلاشبہ مقدار (Quantity) کی تبدیلی سے تھا لیکن اس کے بعد اس میں جو تبدیلی آئی، وہ پہلی تبدیلیوں سے بالکل مختلف نوعیت (Quality) کی تبدیلی ہے۔ لہٰذا اب یہ اور نوع ہے، اور اور حقیقت ہے یعنی اب انسان صرف وہ انسان نہیں رہا جو محض گوشت پوست سے ترکیب پاتا ہے، بلکہ اس کی فطرت میں ایسے "نئے مضمرات" کو داخل کر دیا، یا سمو دیا گیا ہے۔ جو اس کو حیوانیت کی اس سطح سے اٹھا کر

روحانیت و اخلاق کے فرازِ اعلیٰ تک اچھال دینے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ اور یہی اس کی زندگی کا اصل مقصد ہے۔ اب آدم جو اس نوع کا پہلا قافلہ سالار ہے، صرف آدم ہی نہیں، اللہ کا پیغمبر بھی ہے۔ اور اسے دنیا میں اب ایسی تہذیب و ثقافت کو رواج دینا ہے، جس سے انسان یہ ثابت کر سکے کہ یہ دنیا میں جس نیابت کا علمبردار ہے، وہ ان حیوانی و سفلی آرزوؤں کی نیابت نہیں بلکہ اللہ کی نیابت ہے۔ یعنی اب اسے علم پھیلانا ہے، حکمت و دانائی سے آراستہ ہونا ہے۔ تخلیق و آفرینش کے فرائض انجام دینا ہے۔ تسخیرِ کائنات کی مہم سر کرنا ہے۔ اس لیے نہیں کہ موجودہ تہذیب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے موت و ہلاکت کے گڑھوں میں ڈھکیل دیا جائے، بلکہ اس لیے کہ ایک ایسی نئی تہذیب کو بروئے کار لایا جائے، جو انسان کو زیادہ سے زیادہ خوشیوں اور مسرتوں سے مالا مال کر دے۔ اب اسے اللہ سے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو استوار کرنا ہے اور دین سے منحرف اور بھاگی ہوئی قوموں کو پھر سے اس کی چوکھٹ پر جھکانا ہے۔ "مقامِ انسانیت" کے بارہ میں اسی سوال کے جواب پر کسی بھی قوم و ملک کی تہذیب و تمدن کی کامیابی یا ناکامیوں کا انحصار ہے کہ ہمارا تہذیبی سفر کس نقطہ یا مفروضہ سے شروع ہو۔ کیا ہم صرف حیوان ہیں، اور عاقل ہونے کی حیثیت سے اس سے زیادہ کے مکلف نہیں کہ ان ضرورتوں اور تقاضوں کی تکمیل و ارتقا کے سلسلہ میں کوشاں رہیں، جو ہماری حیوانی فطرت کی جانب سے ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ یا ہمارا شرفِ انسانیت اس سے زیادہ کا مقتضی ہے اور ہمارے وجود کا ایک سرا اگر گوشت پوست سے تعلق رکھتا ہے تو دوسرا ان ملکوتی اور قدوسی صفات سے ملا ہوا ہے جن کی وجہ سے یہ انسان مسجودِ ملائک اور اشرف المخلوقات ہونے کا بجا طور پر دعویدار ہے۔ مغرب کی گمراہی یہ ہے کہ اس نے اپنے تہذیبی سفر کا آغاز حیوانیت کے نقطۂ نظر سے کیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج کا انسان اپنی حیرت انگیز فکری صلاحیتوں کے باوجود حیوانیت کی کھال سے باہر نہیں نکل سکا۔ اور روز بروز جنسی بے راہ روی، اخلاقی انحطاط، ظلم اور استحصال کا خوگر ہوتا چلا گیا۔ تہذیب و ثقافت کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس سوال کا دو ٹوک جواب دینا مشکل ہے، کیونکہ اس سے بھی پہلے دریافت طلب بات یہ ہے کہ کون تہذیب و ثقافت زیرِ بحث ہے؟ اگر انسان ایک سادہ، ابتدائی معاشرہ کا رکن ہے، تو اس کا اشکال یہ ہے کہ اس معاشرہ کو تہذیب و تمدن کی جملہ برکات اور سہولتوں سے بہرہ مند کیا جائے۔ اور اگر اس کے برعکس وہ اس معاشرہ

میں رہ رہا ہے، جہاں پوری زندگی صنعتی ارتقا کے سانچوں میں ڈھل چکی ہے، اور کل پرزوں کی ہمہ گیری نے انسان کو بھی کل پرزہ کے روپ میں بدل دیا ہے، اس کی انفرادیت کو ختم کر دیا ہے، اس سے اس کے فرصت کے عزیز لمحوں کو چھین لیا ہے، اس کے لطیف جذبات و احساسات کو کچل دیا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عظیم اور فعال انسان مشین کا محض ضمیمہ بن کر رہ گیا ہے تو ان حالات میں تہذیب و ثقافت کا مطمح نظر یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایسے خوش آیند حالات پیدا کرے، جن سے انسان پھر اپنی گمشدہ عظمت کو پالے۔ یعنی تہذیب کے دھاروں پر ضبط اور قابو حاصل کر سکے اس کو زیادہ سے زیادہ معقول (Rational) بنیادوں پر استوار کر سکے اور بجائے اس کے کہ اس کی حیثیت محض مقہور و مجبور انسان کی ہو۔ اس میں جباری و قہاری کی وہ صفات دوبارہ پلٹ آئیں۔ جن سے کہ اس کا پیرہن ذات تیار ہوتا ہے۔

اس صورت میں اس صنعتی ارتقا کی ہمہ گیریوں کو مختصر کرنا ہو گا۔ اس کے جبر کے دائرہ کو سمیٹنا ہوگا۔ اور انسانی زندگی کے قلبی و فکری لطائف کو اس کی آہنی گرفت سے زیادہ سے زیادہ مقدار میں رہائی دلانا ہو گی۔

آپ تاریخ پر غور کیجیے۔ شروع سے لے کر اب تک آپ یہ دیکھیں گے کہ یہی دو محور ہیں جن کے گرد انسان کی فکر و عمل کی کششیں گھومتی رہتی ہیں اور ہمیشہ انہی کے گرد گھومتی رہیں گی۔ یعنی اگر قانون اور معاشرہ سادہ ہے تو اس کو وسعت دی جائے، اس کو زیادہ مفصل، زیادہ پیچیدہ اور ہمہ گیر بنایا جائے۔ اور اگر اس پیچیدہ تر زندگی کے قفس میں انسانیت کا دم گھٹنے لگے اور طائر روح پھڑپھڑانے لگے تو اس کے کچھ حلقوں اور تیلیوں کو توڑ دیا جائے۔ اجمال و تفصیل، سادگی، و رنگارنگی کے انہی دو نقطوں کے مابین فکر و عمل کی تگ و تاز کو ترتیب دینا تہذیب و ثقافت کی اصل غرض و غایت ہے۔

لیکن یہ سوال اسی موڑ پر ختم نہیں ہو جاتا حل طلب یہ بحث رہ جائے گی کہ جب تک تہذیب و تمدن کے شعوری ارتقا کے لیے کوئی نصب العین متعین نہ کیا جائے اور نہ بتایا جائے کہ کیونکر ہم اس کو زیادہ مفید بہتر اور حسین بنا سکتے ہیں، اجمال سے تفصیل کی طرف بڑھنے اور تفصیل سے اجمال و اختصار کی راہوں کو اختیار کرنے میں سخت دشواری پیش آئے گی۔

ہماری رائے میں اس سوال کا جواب اس وقت آسان ہو جائے گا جب ہم اس آخری اہم سوال

سے نمٹ لیں گے کہ کیا تہذیب و ثقافت کی اپنی چال بھی ہے اور نقطۂ اجمال سے تفصیل کی طرف قدم بڑھانے کا کیا طریق ہے کہ ماضی کے کچھ عناصر کو یہ چھانٹے، کچھ فنی قوتوں کو اپنائے اور آگے کی طرف رواں دواں رہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے تو پھر یہ پوچھا جائے گا کہ وہ کون عناصر ہیں جن کو یہ آغوش میں لیے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔

یہ پیرایۂ بیان کسی شخص کو غلط فہمی میں نہ ڈال دے۔ ہم جب تاریخ اور اس کی چال کا ذکر کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ تاریخ کو ہم کوئی مجرد مابعد الطبیعی حقیقت قرار دیتے ہیں۔ جو از خود فعال اور کارفرما ہے اور قوموں کے سیاسی، اخلاقی اور اقتصادی مقدر کو وضع اور متعین کرتی ہے۔ ہمارے نزدیک جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں تاریخ کے اپنی چال کے معنی صرف یہ ہیں کہ قومیں اپنے شعوری انتخاب میں کن عوائد و رسوم کو اپناتی ہیں۔ کن عقائد و تصورات پر جمی رہتی ہیں یا کن تہذیبی عناصر کو نئی تابش و ضوبخش کر آگے بڑھاتی ہیں۔ ہم جب بھی تاریخ کا نام لیتے ہیں اس میں قوموں کے شعور و عمل کو نظر انداز نہیں کرتے بلکہ تاریخ کو اسی شعور و عمل کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تاریخ کے بارہ میں اس وضاحت کے بعد اصل سوال کا جواب یہ ہے کہ جس طرح حیاتیاتی سطح پر نباتاتی اور حیوانی جسم نئے خلیوں کو اپناتا ہے، نئے خون سے تازگی اور نشوونما حاصل کرتا ہے اور پرانے بوسیدہ خلیوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیتا ہے، ٹھیک اسی طرح اور بالکل یہی کردار انسان کا اجتماعی جسم انجام دیتا ہے۔ یعنی انسانی معاشرہ ماضی کی اقدار و رسوم کو زندگی کی کسوٹی پر پرکھتا اور جانچتا ہے۔ ان میں جو اجزا، متحرک، جاندار اور قائم رہنے والے ہوں، ان کو اپنے سفر میں ساتھ لیتا ہے، پھر ان پر کچھ اضافہ کرتا ہے، ان کو نئے رنگ اور نئے اسلوب کے ساتھ چمکاتا اور سنوارتا ہے اور اس لائق بناتا ہے کہ یہ حال و مستقبل کے تغیرات کا ساتھ دے سکیں اور آگے بڑھ سکیں۔

اس مرحلہ پر انسانی جسم اور اجتماعی جسم کے حیاتیاتی تقاضوں میں جو فرق ہے اس کو نہ بھولنا چاہیے۔ نباتاتی اور انسانی جسم میں انتخاب و ارتقا کا یہ فعل اللہ تعالیٰ کے اُن قوانین کے مطابق خود بخود ہوتا ہے جو اس کی کمال حکمت و تخلیق کا کرشمہ ہیں۔ اور تہذیبی ارتقا کے عمل کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں قوموں کا فکر و شعور اور عمل و کردار بروئے کار آئے۔ ورنہ ایسا بھی

ہوتا ہے کہ تہذیب ترقی کرنے کے بجائے کچھ عرصے کے لیے تنزل کی راہ پر ہو لے۔ اور اگر تاریخ کا یہ تجزیہ صحیح ہے تو پھر تہذیب و ثقافت کی غرض و غایت یہ قرار پاتی ہے کہ ہر دور میں انسان یہ دیکھے کہ وہ کون سے عناصر، صورتیں اور نظریات ایسے ہیں جن میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے جن کے وجود و بقا کے لیے منطقی وجہ جواز پایا جاتا ہے۔ اور کون وہ عقائد و رسوم ہیں جو زندگی و بقا کی قیمت سے محروم ہو چکے ہیں، جن کو اب گلے کا ہار بنائے رکھنا بلا وجہ نوع انسانی کو زحمت میں ڈال دینے کے مترادف ہے۔

اور جب ان دونوں میں فرق و امتیاز کی حدود واضح ہو جائیں تو پھر ایک فرض شناس معاشرہ کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ان زندہ، انفع، اور جمیل عناصر حیات کو آگے بڑھانے کی کوشش کرے۔

مسئلہ کی اس تفصیل کے بعد اب پھر اس سوال کی طرف لوٹ آئیے کہ آخر ہم شعور و ادراک کے کس نقطۂ نظر سے یا تہذیب و تمدن کے کس معیار کے تحت شعائر رسوم کی زندگی کی جانچ پڑتال کریں۔ عقائد و نظریات کی استواری معلوم کریں۔ اس کی پرکھ کے لیے بھی تو کوئی نہ کوئی پیمانہ ہونا چاہیے۔ کوئی منزل اور مطمح نظر ہونا چاہیے۔

اس سے پہلے ثقافت کے تصور کو نکھارنے کی غرض سے جن متعدد تعریفات کو بیان کیا گیا ان میں جو تعریف ہمیں زیادہ بھائی وہ یہ تھی کہ تہذیب کے معنی ان تضادات کو ختم کرنا اور ان اختلافات کو دور کرنا ہے جو روح و جسم میں پائے جاتے ہیں، جو انسان اور کائنات میں حائل ہیں اور یا جو انسان اور اس کے مابین رشتہ و تعلق کی نوعیتوں کو اس نہج سے متعین کرتے ہیں جس سے شرفِ انسانی ہی قائم نہیں رہتا، اس لیے کہ اگر کوئی تہذیب ان تناقضات کو ختم نہیں کرتی اور ان سوالات کا صحیح جواب مہیا نہیں کرتی جو ان تناقضات کی بنا پر ابھرتے ہیں تو وہ اپنا تاریخی سفر مقصد و منزل کی طرف جاری نہیں رکھ پائے گی۔ ان اختلافات کو رفع کرنا اور معاشرہ کے لیے ایسے اصول پیش کرنا جو اس میں زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی اور توازن پیدا کر سکیں، نہ صرف تہذیب و تمدن کی زندگی و بقا کا اہم جزو ہے بلکہ اس کے تاریخی ارتقا کی یہی غرض و غایت بھی ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم اسلام کے تصورِ ثقافت پر کچھ کہیں، فکر و نظر کے اس موڑ پر یہ بحث زیادہ مفید رہے گی کہ رفعِ تناقض کے سلسلہ میں اسلام کا کردار کیا رہا ہے، اس نے کہاں تک اس خلیج کو پاٹا ہے اور اپنی تخلیقی کوششوں سے کیونکر ایک ہم آہنگ اور متوازن معاشرہ کی داغ بیل ڈالی اور اسے پروان چڑھایا ہے۔ آیئے تناقض اور رفع تناقض کی ان صورتوں پر ایک سرسری نظر ڈالتے چلیں داخلیت پسندی ( ) اور خارجیت پسندی ( )

) دنیا کی تہذیبی تاریخ میں ہمیشہ سے دو ایسے بنیادی اصول رہے ہیں کہ جن پر بڑی بڑی مذہبی تحریکات کی تعمیر ہوئی ہے۔

داخلیت پسندی سے مراد یہ ہے کہ حقیقت کو صرف روح و باطن کے تقاضوں ہی میں منحصر اور دائر مانا جائے، اور ان تقاضوں کو تسلیم کرنے سے یکسر انکار کر دیا جائے جو جسم کی وجہ سے اُبھرتے ہیں یا جنھیں ہماری حیاتیاتی فطرت پیدا کرتی اور بھڑکاتی ہے۔ مزید برآں اس انکار میں یہ چیز بھی داخل ہے کہ ان شدید اور ٹھوس تقاضوں سے بھی قطع نظر کر لیا جائے جن کو جسم خارجی کی تیز و تند حقیقتیں جنم دیتی ہیں۔

خارجیت پسندی سے مراد ایسی تحریکات ہیں جو جسم و مادّہ کے تانے بانے سے تیار ہوئی ہیں جو حقیقتِ انسانیہ کو اس سے زیادہ کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں کہ یہ دراصل حیوان ہے جسم ہے اور اپنی اس مادی علمی، اور تہذیبی فتوحات کے باوجود آخر آخر میں ارتقا کی لطیف شاہکار ہے جو پوری کائنات میں جلوہ فرما ہے۔

خارجیت پسندی کے حامی روح کو نہیں مانتے، لطائفِ قلب کو تسلیم نہیں کرتے اور انسان کے اندر اس ملکوتی جوہرِ ادراک پر ایمان نہیں رکھتے جس کی وجہ سے اس عالم ہست و بود میں منفرد مقام حاصل ہے، ان کے نزدیک انسان چونکہ اسی آب و گل سے تو بنا ہے، اسی آب و ہوا میں تو پروان چڑھا ہے اور انہی رشتوں کی کارفرمائی اور تاثرات سے تو اس کے ادراک میں تلاش و ضو پیدا ہوئی ہے، جن کا تعلق مادہ، جسم اور ماحول سے ہے۔ لہٰذا یہ کائنات سے الگ تھلگ کوئی وجود نہیں رکھتا۔ اس کی فطرت وہی ہے جو ساری کائنات میں رچی بسی ہے اور اس پر انہی طبعی اور مادی قوانین اور تقاضوں کی حکمرانی ہے، جو ذرّے سے لے کر پہاڑ تک کو اپنے دائرہ اثر میں لیے

لیے ہوئے ہیں۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہی دو نظریے یا بنیادیں ہیں جن پر تہذیب قدیم و جدید کے عمارتیں تعمیر ہوئے ہیں۔ داخلیت پسندی نے کس نوع کی تہذیب کی تخلیق و پرورش کی۔ کس قالب میں معاشرہ کو ڈھالا اور انسانی زندگی نے اس سے کیا اثر لیا اور خارجیت کے تصور نے انسانی زندگی کو کن راہوں پر ڈالا، کیا نتائج پیدا کیے اور انسانیت کے رخ و رخسار کو کس حد تک سنوارا اور بگاڑا۔ ان چیزوں کو جانے بنا ہم یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ تماشہ گاہ عالم میں اسلام نے کیا کردار انجام دیا اور کس طرح توازن و اعتدال کی حسین راہ اختیار کی۔ بات یہ ہے کہ زندگی کے بارہ میں یہ دونوں رجحانات انتہا پسندانہ ہیں۔ یہی وجہ ہے ان میں نفع و فائدہ سے کہیں زیادہ نوع انسانی کو خسارہ کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

اثمھما اکبر من نفعھما

مثلاً وہ تمام تحریکیں اور مذاہب جنھوں نے داخلیت پسندی پر زور دیا اگرچہ ایسی بلند پایہ شخصیتوں کو پیدا کیا، جنھوں نے دنیا کو ٹھکرا کر آخرت کو ترجیح دی، مقاصد اور معانی پر اپنی توجہ کو بہر حال مرکوز رکھا، ظاہر سے زیادہ باطن و مغز کی طرف متوجہ رہے اور حق و صداقت کی خاطر بے پناہ ایثار و قربانی کا ثبوت دیا۔ تاہم بالآخر، یہ تمام تحریکیں اور مذاہب رہبانیت اور ترکِ دنیا کی منزل پر آکر رک گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ماننے والے علوم و فنون، اور تہذیب و ترقی کی دوڑ میں دنیا سے پیچھے رہ گئے۔ یہی نہیں ایک طرح کے ابہام کا شکار ہو گئے۔

ٹھیک اسی طرح خارجیت پسند عناصر نے بلاشبہ مذہبی سطح پر زندگی کے سانچوں کی تشریح کی، قانون کے لیے واضح اطلاقات کی تعیین کی، ظاہر الفاظ کی اہمیت کو بڑھایا اور زندگی کو متعین سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ساتھ علوم و فنون کے قافلوں کو بھی آگے بڑھایا اور مادّی ترقیات کو بھی آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ تاہم یہ لوگ زندگی کے باطنی حسن کا نظارہ نہ کر سکے۔ معنی و روح کے لطائف سے محروم رہے اور اس لائق نہ ہو سکے کہ جسم و مادّہ کی چلمنوں کو ہٹا کر عروسِ حقیقت کی جلوہ آفرینیوں سے قلب و نظر کی آسودگی کا اہتمام کر سکیں۔ انھوں

جسم کی فقہ تو مرتب کی، مگر قلب و روح کی فقہ سے آشنا نہ ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس تہذیب سے حیوانیت بڑھی، حیوانیت چمکی اور جسم کے ادنیٰ تقاضوں نے تو طاقت حاصل کی لیکن انسانیت دب اور سمٹ کر رہ گئی۔ حرص، لالچ اور خواہشات کی بے راہ روی نے انتہائی ترقی کی لیکن پاکیزگی، عفاف اور اونچے انسانی جذبات نے سر پیٹ لیا۔ تنگ نظرانہ قومیت نے انسان اور انسان کے مابین دشمنی اور عناد کے بیج تو بوئے اور بغض و تحقیر کی دیواریں تو چنیں۔ مگر عالمگیر انسانی اخوت اور برادری کے تقاضوں کا خیال نہ رکھ سکی۔ اسی طرح سائنس اور ٹیکنالوجی کی فتوحات نے فطرت کے رازہائے دروں پردہ کو تو فاش کیا لیکن اس کرۂ ارض پر ہنستی کھیلتی زندگی کو خطرے میں ڈال دیا۔

ادیان و تحریکات کی تاریخ شاہد ہے کہ اسلام اور تنہا اسلام نے اس تناقض کا حل پیش کیا ہے۔ اسلام نے توحید کے یکساں فلسفہ کی تشریح کی جس کے معنی یہ کہ جس طرح اس کی ذات کثرت و ثنویت سے پاک ہے اسی طرح اس کی پیدا کردہ زندگی میں تناقض و اختلاف کی کثرت پائی نہیں جاتی۔ توحید کی رُو سے زندگی ایک ہے اور روح و جسم اس کے دو اظہار ہیں اور دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لیے نہ تو یہ ممکن ہے کہ تنہا جسم کو اہمیت دی جائے اور تمام اقدار کو ادنیٰ حسّی خواہشات کی روشنی ہی میں ترتیب دی جائے، اور نہ یہ مناسب ہے کہ صرف روح ہی توجہ و التفات کا مرکز و محور ٹھہرے، اور زندگی کی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ راہِ عدل اور بیچ کی راہ بہر حال یہی ہے کہ دونوں کو زندگی جزوِ ترکیبی قرار دیا جائے اور اس حقیقت کا اعتراف کر لیا جائے کہ زندگی کی نشاط آفرینیاں بیک وقت دونوں کی مرہونِ منت ہیں۔ آنحضرتؐ نے حضرت ابو درداء کو مخاطب کر کے اسی حقیقت کی نشان دہی فرمائی تھی:

ان لربك عليك حقاً و ان	تم پر تمہارے پروردگار کا بھی حق ہے۔ تمہارے
لنفسك عليك حقاً و لاهلك عليك	نفس کا بھی حق ہے اور بال بچوں کے بھی حقوق ہیں
حقاً فاعط كل ذي حق حقه[1]	سب ذی حقوق کا پورا پورا حق ادا کرو۔

اسلام نے جسم و روح میں رونما تناقض کو ختم کر کے انسانی زندگی، انسانی فکر اور انسانی تہذیب پر بہت بڑا

---

[1] بخاری

احسان کیا ہے۔ اسلام نہ تو اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ انسان اور کائنات کی فطرت و مزاج میں کوئی فرق نہیں، اور نہ اس چیز کو مانتا ہے کہ اس میں ثنویت کو مان کر کسی بہتر اور صحت مند تہذیبی روایت کی طرح ڈالی جا سکتی ہے۔

قرآن انسان کو صرف حقیقتِ حیوانیہ قرار دینے کے بجائے تکریم و اعزاز کے ایک خاص درجہ میں رکھتا ہے اور اس کی ساخت کو حسن و خوبی کا معجزانہ امتزاج قرار دیتا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

ولقد کرمنا بنی آدم (اسرا۔۷۰) اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی۔

دوسری جگہ فرمایا:

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ (التین) ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔

جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی فطرت و جوہر کے اعتبار سے مکرم ہے اور اس کے بنانے اور سنوارنے میں فطرت نے جس سانچہ کا انتخاب کیا ہے اس سے بہتر سانچے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں وہ تمام خواہشیں، جذبے اور قوی پائے جاتے ہیں جس سے زندگی کا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے اور اس کے ساتھ اس کو فکری علو، ملکوتی تابش اور بلند تر کردار و سیرت سے نوازا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ کائنات اور اس کے تمام مشمولات سے الگ تھلگ ایک خاص مقام کا حامل نظر آتا ہے۔

اسلام نے جسم و روح کے درمیان تناقض کو رفع کرنے کی صورت یہ اختیار کی ہے کہ اس کے گوشت پوست میں پنہاں اس شخصیت کو نکھارنے کی کوشش کی ہے جس پر حقیقی معنوں میں انسانیت کا اطلاق ہوتا ہے، جو علوم و معارف کی یوقلمونیوں کا شیدا ہے، جو تخلیقی جوہر سے آراستہ ہے، جو طبع وقار اور طبع بلند سے بہرہ مند ہے، جو اپنے آقا و مولا سے رشتۂ عبودیت رکھتا ہے، جو متقی ہے، پاکباز ہے اور پاک نہاد ہے، جو انسان ہے مگر ملکوتی صفات رکھتا ہے، محدود ہے مگر فکر و تعمق کی لاتعداد پنہائیوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔

اسلام اس غلط اندیشی کا قائل نہیں کہ جسمانی خواہشات یا حیوانی جذبات کا گلا گھونٹ کر روحانیت کو ابھارا جا سکتا ہے اس لیے کہ روحانیت بجائے خود زندگی کے ایک خاص اظہار کا نام ہے جس میں مجہول اور دبی اور کچلی ہوئی کیفیت کے بجائے ایک طرح کی نشاط آفرینی پائی جاتی ہے اور جس

میں ایک طرح کی قوت اور زور پایا جاتا ہے۔ روحانیت آخر اس کے سوا اور کیا ہے کہ اس کو کردار کی محکمی اور استواری سے تعبیر کیا جائے اور کردار کی محکمی و استواری بہر حال مضبوط قوی چاہتی ہے اور قوی جذبات کی طالب ہے۔ اور اگر ہم ان جذبات ہی کو ختم کر دیتے ہیں یا ان خواہشوں اور آرزوں ہی کا گلا گھونٹ دیتے ہیں جن سے زندگی کا تانا بانا تیار ہوتا ہے تو کردار و سیرت میں استواری کیونکہ پیدا ہوگی یعنی اللہ تعالیٰ سے ملنے کی شدید تر آرزو اور تمنا قوی تر جذبات و خواہشات ہی کی تو رہین منت ہے۔

ٹھیک اسی طرح اسلام اس غلط فہمی ہی کا شکار نہیں کہ صرف جسم کی پرورش سے یا صرف حیوانی آرزوؤں اور خواہشوں کی حوصلہ افزائی سے کردار و سیرت کے گوشے چمک سکتے ہیں۔ اخلاص کے ساتھ انسان عالمگیر اخلاقی اصولوں کی وفاداری کو اپنا شعار ٹھہرا سکتا ہے خود غرضی، لالچ اور ہوس سے باز رہ سکتا ہے۔ یا ملک و وطن کے تنگ نظرانہ تصورات سے دامن کشاں رہ کر اونچی انسانیت کو پا سکتا ہے۔ کیونکہ جسم و مادہ میں قطعی یہ صلاحیت نہیں کہ انسان کو حیوانیت کی پستیوں سے نکال کر اخلاق و روح کی رفعتوں تک پہنچا سکے۔ پتھر کو ہزار مرتبہ اوپر کی طرف پھینکیے اور فضا کی بلندیوں تک اچھال دینے کی سعی کیجیے بالآخر اسے اپنی مادیت سے مجبور ہو کر زمین ہی پر گرنا ہے۔

رہا دوسرا اور تیسرا تناقض، یعنی انسان اور کائنات میں اجنبیت اور بُعد کا جو تضاد ہے اس کو اسلام نے کیونکر رفع کیا ہے اور انسان انسان کے مابین رشتہ و تعلق کی نوعیتوں میں تضادات کی گتھیوں کو اسلام نے کس طرح سلجھایا ہے تو اس کی تفصیل کا محل یہ نہیں۔ ہم اس سے پہلے سیاق کی مختلف صورتوں میں اس حقیقت کی بار بار وضاحت کر چکے ہیں کہ اسلام نہ تو دنیا کو حقیر سمجھتا ہے نہ دشمن قرار دیتا ہے اور نہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی مشکلات پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس اسلام نے تسخیر کائنات کے عقیدہ کو قرآن میں خاصی اہمیت دی ہے اور یہی وہ تہذیبی معیار ہے جس سے کسی قوم کے فکری و عملی ارتقا کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تیسرا تناقض البتہ ابھی تشنہ ہے اور اس کے لیے ہم نے اس بحث کے اختتام پر دو الگ باب مخصوص کر دیے ہیں۔

یہاں تک بحث کا انداز عمومی تھا۔ اب ہمیں اصل موضوع کی طرف لوٹنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ اسلام کا اپنا تصورِ ثقافت کیا ہے؟ (باقی آئندہ)